حکمتِ اقبال

(۳۸)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

خودی کا انقلاب

خودی کی تربیت کے لوازمات۔ خلوت

خدا کا ذکر، آیات اللہ کے طور پر مظاہر قدرت پر غور و فکر، فعل جمیل اور خدا کی محبت کے سوز و سرور سے اُبھرنے والا آرٹ —— خودی کی یہ چاروں فعلیتیں خدا کی محبّت کو ترقی دے کر درجۂ کمال پر پہنچاتی ہیں، تاہم ان میں سے خودی کی ترقی اور تربیت کا زیادہ دار و مدار آخر کار مواظبتِ ذکر، قدرت پر غور و فکر اور فعلِ جمیل پر ہوتا ہے۔ ذکر اور فکر پر اپنی ساری توجہ مرکوز کرنے کے لیے خودی کو خلوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر وہ ذکر اور فکر سے پُورا فائدہ حاصل نہیں کر سکتی۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) خود غارِ حرا میں خلوت گزیں ہوئے تھے۔ اعتکاف کے اسلامی شعار کی غرض و غایت بھی خلوت گزینی ہے۔

خودی را مردم آمیزی دلیلِ نارسائی ہا　　　تو اے دردآشنا بیگانہ شو از آشنائی ہا

از کم آمیزی تخیّل زندہ تر　　　زندہ و جوئندہ و یابندہ تر

وحشت نہ سمجھ اس کو اے مردکِ میدانی　　　کہسار کی خلوت ہے تعلیمِ خود آگاہی!

مصطفٰے اندر حرا خلوت گزید　　　مدّتے جز خویشتن کس را ندید

خُودی کے مقامِ کمال کی کیفیتیں

لہٰذا مومن شروع میں خلوت اختیار کرتا ہے۔ جب مومن خلوت کے ذکر اور فکر کو اور فعل جمیل کو کچھ عرصہ کے لیے بڑی احتیاط اور بڑے ذوق و شوق سے جاری رکھتا ہے تو وہ جلد ہی ایک عظیم الشان انکشافِ حقیقت کے مقام پر پہنچ جاتا ہے، جہاں اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اس مقام پر خودی بے حد سرور اور اطمینان محسوس کرتی ہے اور اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ اس دنیا میں حاصل کرنا چاہتی تھی اس نے وہ سب کچھ پا لیا ہے اور اسے اور کسی چیز کی حاجت نہیں سوائے اس کے کہ جو کچھ اس نے پایا ہے اس کے پاس ہمیشہ موجود رہے اور اس میں ہمیشہ اور اضافہ ہوتا رہے۔ یہی خودی کا مقامِ کمال ہے۔ انسان کی محبّت جو ذکر اور فعلِ جمیل سے رفتہ رفتہ ترقی پاتی رہتی ہے بالآخر اس قدر طاقت ور ہو جاتی ہے کہ انسان کی پوری عملی زندگی پر حکمران ہو جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ مزاحمت کرنے والے غلط تصوّرات یا اپنی کشش کھو کر بالکل مٹ جاتے ہیں، یا اگر ان میں یہ صلاحیّت موجود ہو تو خدا کی محبّت کے ماتحت اس کے خدمت گزار بن جاتے ہیں۔ بہر حال ان میں یہ قوّت باقی نہیں رہتی کہ خودی کو مسلسل عبادت اور اطاعت اور عمل کے ذریعہ سے خدا کی معرفت اور محبت میں ترقی پانے اور معرفت اور محبّت کے مقامِ کمال پر پہنچ کر خدا کا دیدار کرنے سے باز رکھ سکیں۔

خدا کا دیدار

حضورؐ کے ارشادات میں خدا کے دیدار کے مقام کو احسان کا نام دیا گیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ تم خدا کی عبادت اس طرح سے کرو کہ گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو (اَلاِحۡسَانُ اَنۡ تَعۡبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ) شاید بعض لوگوں کو شبہ ہو کہ خدا کو دیکھنا ممکن نہیں لیکن اگر ہم دیکھنے کے عمل کا تجزیہ کریں تو یہ شبہ رفع ہو جاتا ہے۔ جب ہم کسی مادّی چیز کو دیکھتے ہیں تو اس چیز پر نظر ڈالنے اور رؤیت کا احساس کرنے تک جو عمل معرضِ وجود میں آتا ہے وہ یہ ہوتا ہے کہ اس چیز سے جو روشنی کی شعاعیں بکھر رہی ہوتی ہیں وہ ہماری آنکھوں پر پڑتی ہیں۔ ہماری آنکھوں کا محدّب شیشہ

© rasailojaraid.co

انہیں سمیٹ کر چیز کا ایک عکس بناتا ہے جس کی اطلاع عصبِ رؤیت کے ذریعہ سے دماغ تک پہنچتی ہے اور دماغ کی معرفت ہمارے شعور کو اس چیز کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ گویا جو چیز خارج میں موجود کسی جسم کو دیکھتی ہے وہ دراصل ہمارا شعور ہی ہوتا ہے۔ اور ہمارا شعور بھی جو چیز دیکھتا ہے وہ خود وہ جسم نہیں ہوتا بلکہ اس جسم کے چند اوصاف ہوتے ہیں جن کے مجموعہ کو ہی ہم وہ جسم قرار دیتے ہیں۔ دماغ، عصبِ رؤیت، آنکھ اور روشنی فقط ان اوصاف کا علم حاصل کرنے کے آلات یا ذرائع ہیں، جن کو ہمارا شعور اپنے کام میں لاتا ہے۔ جب شعور کو ان اوصاف کا واضح علم ہو جاتا ہے تو خواہ وہ جسم آنکھوں کے سامنے رہے یا نہ رہے، شعور اگر چاہے تو اس کو پھر دیکھ سکتا ہے۔ اور جس قدر شعور کا علم واضح ہو گا اس قدر اس کی بلاواسطہ رؤیتِ جسم بھی واضح ہو گی۔ جب مومن کے دل میں مطالعۂ جمال اور فعلِ جمیل سے حق تعالیٰ کے اوصاف کی محبت درجۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے تو شدّتِ محبّت کی وجہ سے ذکر اور فکر کے دَوران میں مومن کی ساری توجہ ان اوصاف پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ وہ اوصاف اس کے شعور پر چھا جاتے ہیں اور ان کا علم اس کے شعور پر پوری طرح سے حاوی ہو جاتا ہے۔ اس وقت مومن کا شعور حق تعالیٰ کو بالکل اس طرح سے دیکھتا ہے جس طرح سے اس دنیا کی کسی اور چیز کو دیکھنا اس کے لیے ممکن ہوتا ہے۔ چونکہ یہ رؤیت ان آنکھوں سے نہیں ہوتی جو مادی اجسام کے دیکھنے کے لیے ایک ذریعہ کے طور پر بنائی گئی ہیں، اس لیے حدیث کے الفاظ ہیں کہ خدا کی عبادت اس طرح سے کر گویا تو خدا کو دیکھ رہا ہے (کَاَنَّکَ تَرَاہُ) یعنی مومن خدا کو دیکھتا تو ہے لیکن اس کا دیکھنا ان آنکھوں کے ذریعہ سے عمل میں نہیں آتا۔ یہودیوں نے موسیٰ علیہ السّلام سے مطالبہ کیا تھا کہ جب تک ہم خدا کو رُوبرُو نہ دیکھیں ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے، حالانکہ ایمان لانا خدا کو دیکھنے کی پہلی شرط تھی۔ اس کٹ حجتی کے لیے ان کو سزا دی گئی۔

ذات را بے پردہ دیدن زندگی است
بر مقامِ خود رسیدن زندگی است

ایک زوردار کشش

اپنے مقامِ کمال کے قریب پہنچ کر خودی خدا کی ذات کے لیے ایسی زوردار کشش محسوس

کرتی ہے کہ اس کا اختیار اپنے آپ پر باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا وہ نہایت ہی بے بس ہو کر اپنے محبوب کی طرف کھنچ جاتی ہے۔ اور کچھ عرصہ کے لیے اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا وہ اپنے محبوب کی آغوش میں چلی گئی ہے اور محبوب کے ساتھ پیوست ہو کر ایک ہو گئی ہے، جیسے ایک لوہے کی سوئی جب آہستہ آہستہ مقناطیس کے نزدیک لائی جا رہی ہو تو مقناطیس کے قریب پہنچ کر ایک مقام ایسا آجاتا ہے جہاں مقناطیس اسے خود بخود فی الفور اٹھا لیتا ہے۔ یہ خودی کے ارتقاء کی وہ حالت ہے جو اسے خلوت میں عبادت سے حاصل ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے۔ تاہم اس کی ترقی کے اور مقامات جو جلوت میں محبوب کے مقاصد کی تکمیل کے لیے پُرزور اور دلیرانہ عمل سے حاصل ہو سکتے ہیں بعد میں آتے ہیں۔ جب تک خودی اس حالت میں ہوتی ہے (اور اس حالت میں وہ بالعموم بہت تھوڑی مدت کے لیے رہتی ہے) وہ خود فراموشی کے عالم میں ہوتی ہے اور اس کا اپنے الگ وجود کا احساس اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ گویا بالکل ہی مفقود ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا ہی خدا ہے اور وہ نہیں۔ اس حالت میں خودی زمان و مکان کی قیود میں نہیں ہوتی، کیونکہ وہ دونوں کے خالق کے ساتھ ہوتی ہے۔ جب انسان اس حالت سے اپنے آپ کی طرف لوٹتا ہے تو دوسروں کے لیے اس کی کیفیت کو پوری طرح سے بیان نہیں کر سکتا اور اظہارِ مطلب کی بہترین کوششوں کے باوجود اپنے الفاظ کو ناکافی پاتا ہے، بلکہ الفاظ اس کے مطلب کا حجاب بن جاتے ہیں۔ لہٰذا جو شخص اس حالت کی پوری کیفیت کو جاننا چاہے اسے خود ہی اس میں سے گزرنا چاہیے۔

ہر معنیٔ پیچیدہ در حرف نمی گنجد   یک لحظہ بدل در شو شاید کہ تو دریابی

حقیقت یہ ہے جامۂ حرف تنگ!   حقیقت ہے آئینہ، گفتار زنگ!

مولانا روم فرماتے ہیں کہ عشق کی کیفیت عشق ہی بیان کر سکتا ہے۔ کوئی آفتاب کو جاننا چاہے تو اسے آفتاب ہی کو دیکھنا چاہیے۔

ہر چہ گویم عشق را شرح و بیاں   چوں بعشق آیم خجل باشم ازاں
گرچہ تفسیر و بیاں روشنگر است   لیک عشقِ بے زباں روشن تر است
چوں قلم در وصفِ ایں حالت رسید   ہم قلم بشکست و ہم کاغذ درید
عقل در شرحش چو خر در گل بخفت   شرحِ عشق و عاشقی ہم عشق گفت

© rasailojaraid.com

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب گر دلیلت باید از وے رو متاب

ایک نئی قسم کی ولادت

چونکہ خودی کی یہ حالت جب گزر جاتی ہے تو انسان کی ایک ایسی نئی زوردار اور حیرت انگیز طور پر فعّال زندگی کا سبب بنتی ہے جسے انسان کی نئی زندگی کہنا چاہیے۔ اس لیے اسے اقبال ایک قسم کی "پیدائش" قرار دیتا ہے اور اسے بچے کی پیدائش سے ممیز کرنے کے لیے انسان کی پیدائش کا نام دیتا ہے۔ اس انسانی قسم کی پیدائش کے موقع پر انسان کائنات کی حدودِ زمان و مکاں کو توڑ کر باہر نکل آتا ہے، جس طرح سے انسان اپنی حیوانی قسم کی پیدائش کے وقت ایک بچہ کی صورت میں اپنی ماں کے پیٹ کی حدود سے باہر نکل آتا ہے۔ اس پیدائش کے بعد وہ کائنات کے اندر نہیں ہوتا بلکہ کائنات اس کے اندر ہوتی ہے۔

ایں پستی و بالائی، ایں گنبدِ مینائی
گنجد بدلِ عاشق با ایں ہمہ پہنائی

انسان کی حیوانی پیدائش (جسے بچہ کی پیدائش کہا جاتا ہے) شکستِ شکم سے ہوتی ہے۔ اور انسانی پیدائش عالمِ زمان و مکان کی شکست ہے۔

زادنِ طفل از شکستِ اشکم است
زادنِ مرد از شکستِ عالم است

اس انسانی قسم کی پیدائش سے بہرہ ور ہونا انسان کی بڑی خوش نصیبی ہے کیونکہ جس طرح بچے کو پیدائش کے بعد شباب حاصل ہوتا ہے اسی طرح انسان کو اس نئی قسم کی پیدائش کے بعد ایک نئی قسم کا شباب حاصل ہوتا ہے۔

زادن اندر عالمِ دیگر خوش است
تا شبابِ دیگرے آید بدست

زمان و مکان کی بندشوں سے رہائی کا یہ مقام مومن کی ترقی کے راستہ کی ایک ضروری قدرتی منزل ہے جسے مومن ضرور پا کر رہتا ہے، بشرطیکہ اس کی نظریاتی یا نفسیاتی نشوونما میں کوئی رکاوٹ پیدا

com

نہ ہو اور وہ صحیح قدرتی طریق سے جاری رہے۔ لہٰذا خود مومن کو بھی اس بات کے لیے کوشاں ہونا چاہیے کہ اس کی محبت کی قدرتی نشوونما جاری رہے اور اس میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو تاکہ وہ اس مقام کو پالے۔ جب تک وہ اس مقام کو نہیں پاتا اس کا ایمان ناقص رہتا ہے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق!

مشو در چار سوئے ایں جہاں گم
بخود باز آ و بشکن چار سو را

مومن کا یہی وہ مقام ہے جس کی وجہ سے مومن چرخ نیلی فام اور سورج اور چاند اور ستاروں کی بلندیوں سے مرعوب نہیں ہوتا، بلکہ ان کو بحرِ وجود کے گرداب اور اپنے راستہ کی رکاوٹیں سمجھتا ہے اور اپنی منزلِ مقصود کو ان سے بہت آگے دیکھتا ہے۔

فضا تری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے
قدم اٹھا، یہ مقام آسماں سے دور نہیں

دل اگر اس خاک میں زندہ و بیدار ہو
تیری نگہ توڑ دے آئینۂ مہر و ماہ!

دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا
مہ و ستارہ ہیں بحرِ وجود میں گرداب!

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے!

اس مقام کو پانے والے خودشناس لوگ وہی ہیں جو اس عالمِ خاکی کی حدود سے باہر کود جاتے

© rasailojaraid.com

ہیں اور جنہوں نے آسمان سورج اور ستاروں کا طلسم توڑ ڈالا ہے۔

خود آگہاں کہ ازیں خاکداں بروں جستند ۔۔۔ طلسم مہر و سپہر و ستارہ بشکستند

انسان کی جولانگاہ یا مقصودِ عمل یہ مادی دنیا نہیں جو زیرِ آسمان آب و گل کا ایک کھیل سا بنا ہوا ہے، بلکہ اس مادی دنیا سے پرے اسے خدا کے عرش تک پہنچنا ہے اور خدا کی محبت کو حاصل کرنا ہے۔ انسان کی منزلِ مقصود خدا ہے، یہ مادی دنیا نہیں۔

شعلہ درگیر زد در خس و خاشاکِ من
مرشدِ رومی کہ گفت منزلِ ماکبریاست

انسان کا آسمان یہ ردائے نیلگوں نہیں جسے لوگ آسمان سمجھتے ہیں، بلکہ اس کا آسمان اس سے پرے ہے۔ یہ آسمان تو نگاہوں کا ایک طلسم تھا جو خدا کے بے حجاب ہونے سے ٹوٹا اور ٹوٹ کر فقط ایک ردائے نیلگوں ثابت ہوا۔ خدا کے دیدار سے یہ مسئلہ حل ہوا کہ میرا آسمان یعنی میری بلند ترین امیدوں اور آرزوؤں کی حد کیا ہے۔ میں اپنی تمناؤں کی فضا میں ایک ایسے قافلہ کے ساتھ پرواز کر رہا تھا جس میں مہر و ماہ و مشتری بھی شامل تھے اور میں یہ سمجھتا تھا کہ یہ میرے ہم عنان ہیں، لیکن ان کا قافلہ تھک کر رہ گیا اور میری پرواز پھر بھی جاری تھی۔ یعنی میری منزلِ مقصود مہر و ماہ و مشتری سے پرے ایسی جگہ پر ہے جہاں اس قدر بلند ہونے کے باوجود ان کی رسائی نہیں۔ عشق کی ایک ہی جست سے میں نے اس زمین و آسمان کی حدود کو پار کر لیا اور میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ یہ کائنات بے کراں ہے۔ اقبال نے ایک غزل کے چند اشعار میں اس مضمون کو ادا کیا ہے۔

اپنی جولانگاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں ۔۔۔ آب و گِل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں
بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم ۔۔۔ اِک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں
کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا ۔۔۔ مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں
عشق کی اِک جست نے طے کر دیا قصہ تمام ۔۔۔ اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

ایمانِ کامل کا نشان

جو مومن زمان و مکان کی بندشوں سے آزاد نہیں ہوا وہ ابھی ماسوی اللہ کے طلسم میں گرفتار ہے

اور پوری طرح سے مؤحد نہیں بن سکا۔

کسے کہ از دو جہاں خویش را بردن نہ شناخت
فریب خوردہَ ایں نقش باطل است ہنوز

جاوید نامہ میں جب شاعر رومیؔ سے پوچھتا ہے کہ معراجِ انسانی کیا ہے تو رومی جواب دیتا ہے کہ وہ خدا کے روبرو ہو کر انسان کا اپنا امتحان کرنا ہے کہ آیا وہ خدا کے سامنے ٹھہر سکتا ہے یا نہیں اور اس کے ہوش و حواس قائم رہتے ہیں یا نہیں۔ اگر وہ ٹھہر سکے اور اس کے حواس مختل نہ ہوں تو وہ پختہ اور قوی اور کامل عیار ہے ورنہ مجذوب ہو کر بےکار ثابت ہو جائے گا۔ اپنی روشنی کو بڑھانا اچھا ہے لیکن سورج کے سامنے لاکر اسے آزمانا چاہیے کہ وہ اتنی کم تو نہیں کہ ماند پڑ جائے۔

چیست معراجِ آرزوئے شاہدے
امتحانے روبروئے شاہدے
تابِ خود را بر فزودن خوشتر است
پیشِ خورشید آزمودن خوشتر است

پھر شاعر رومی سے پوچھتا ہے کہ خدا کے سامنے آنا ہم خاک و آب سے بنے ہوئے انسانوں کے لیے کس طرح ممکن ہے۔ خدا امر اور خلق (یعنی زمان و مکان کی کائنات) کا مالک امر اور خلق سے باہر ہے اور ہم زمان و مکان کے جال میں پھنسے ہوتے ہیں۔ رومی جواب دیتا ہے کہ 'سلطان' تمہارے ہاتھ آجائے تو تم زمان و مکان کی اس تعمیر کو جو زمین و آسمان کی صورت میں نظر آتی ہے توڑ سکتے ہو۔ جو شخص نکتہ سلطان سے استفادہ کر کے زمان و مکان کے طلسم کو نہیں توڑتا وہ جہالت کی موت مرتا ہے اور مر کر مور و ملخ کی طرح مٹی میں مل جاتا ہے۔ تم اس زمان و مکان کی دنیا میں ایک ولادت سے پہنچے تھے۔ اب ایک اور ولادت سے ہی اس سے باہر جا سکتے ہو اور اس کی بندشوں سے آزاد ہو سکتے ہو۔

باز گفتم پیشِ حق رفتن چساں
کوہِ خاک و آب را گفتن چساں
آمرِ خالق بروں از امر و خلق
ما زشست روزگاراں خستہ خلق

© rasailojaraid.com

گفت اگر سلطاں ترا آید بدست
مے تواں افلاک را از ہم شکست
نکتۂ اِلّا بسلطاں یاد گیر!
ورنہ چوں مور و ملخ در گِل بمیر!
از طریقِ زادن اے مردِ نکوئے
آمدی اندر جہانِ چار سُوئے
ہم بروں جستن بزادن مے تواں
بندہا از خود کشادن مے تواں

یہاں قرآن کے اس اشارہ کی طرف تلمیح ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں سے خطاب کرکے فرمایا ہے کہ اے جنّو اور انسانو! اگر تم سے ہوسکے تو کائنات کی حدُود سے باہر نکل جاؤ، لیکن بغیر سلطان (یعنی غالب کرنے والی حجت یا قوت) کے تم ایسا نہیں کرسکو گے!

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۭ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۝

اقبال کے نزدیک سلطان سے مراد رُوح کا وہ مقام ہے جہاں وہ عبادات اور نوافل کی کثرت سے اس قابل ہوجاتی ہے کہ زمان و مکان کی حدود سے نکل کر خدا سے ملاقی ہوجائے۔

(جاری ہے)

تنظیمِ اسلامی کی انقلابی دعوت کا نقیب

ماہنامہ
میثاق
لاہور

زیرِ ادارت: ڈاکٹر اسرار احمد

فی شمارہ -/۵ روپے   سالانہ زرِ تعاون -/۵۰ روپے

.com
com